موجودہ نظامِ تعلیم کا اساسی تخیُّل

لارڈ میکالے کی تاریخی یادداشت

ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

(ذیل میں ہم مشہور قانون دان اور ماہر تعلیم لارڈ میکالے کی اس تاریخی یادداشت کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو اُس نے برعظیم ہند میں نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے لیے ۱۸۳۵ء میں اُس وقت کے گورنر جنرل کے سامنے پیش کی تھی۔ اِس وقت جبکہ مسئلہ تعلیم ہمارے ملک کے تمام سوچنے والے افراد کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُن عزائم اور مقاصد کو اچھی طرح سمجھ لیں جن کو سامنے رکھ کر انگریزی سامراج نے ہمارے لیے موجودہ نظامِ تعلیم تجویز کیا تھا۔

ترجمہ میں اس بات کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ یہ اُس یادداشت کی آزاد ترجمانی نہ ہو بلکہ اُس کے انگریزی متن کو لفظ بلفظ اردو میں ڈھال دیا جائے (مترجم)}

مجلس تعلیماتِ عامہ میں جو حضرات شریک ہیں اُن میں سے بعض اصحاب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اب تک وہ جس طریقے پر عمل پیرا رہے ہیں، اُسے برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۸۱۳ء میں قطعی طور پر متعین کر دیا تھا۔ اگر اس رائے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک مجلسِ قانون ساز ہی کوئی قانون پاس نہ کرے، نظامِ تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اندریں حالات میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اُن مخالفانہ بیانات کی ترتیب و تسوید میں حصہ لینے سے احتراز کروں جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں اور جو کچھ مجھے اس موضوع پر کہنا ہے اس کے لیے اس وقت کا

انتظار کروں جب یہ مسئلہ کونسل آف انڈیا کے ایک رکن کی حیثیت سے میرے سامنے پیش ہو۔

میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کسی قانون کے اندر محض الفاظ کے الٹ پھیر سے وہ معانی کس طرح پیدا کیے جاسکتے ہیں جو اس وقت اس میں سے اخذ کیے جارہے ہیں۔ اس میں اُن علوم اور زبانوں کا جو ہمیں پڑھانی مقصود ہیں کوئی ذکر تک نہیں ہے۔ اس میں تو محض اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ احیائے ادب، ہندوستانی فضلاء کی حوصلہ افزائی اور برطانوی علاقوں کے باشندوں میں مختلف علوم کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت نے ایک رقم مختص کر دی ہے۔ بعض لوگ منطقی استدلال سے اور بعض ایک بدیہی حقیقت سمجھتے ہوئے اس امر کے دعویدار ہیں کہ ادب سے پارلیمنٹ کی مراد عربی اور سنسکرت ادب ہی ہو سکتی ہے۔

وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستانی جو ملٹن کی شاعری، لاک کی الٰہیات، اور نیوٹن کی طبیعیات کا شناسا ہے اُسے "دیسی عالم" کے معزز لقب سے سرفراز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ لقب تو انہی افراد کو زیب دیتا ہے جنہوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں کُشا گھاس کے مختلف استعمالات اور گیان کے اسرار و رموز پا لیے ہیں۔ میرے نزدیک اس قانون کی یہ تعبیر کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے میں اس سے ملتی جلتی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ پاشائے مصر — وہ مصر جو کبھی علم و فن کے اعتبار سے یورپین اقوام سے بھی ممیز اور ممتاز تھا مگر اب بہت پسماندہ ہے — ایک خاص رقم ادب کی توسیع و اشاعت اور وہاں کے علماء کی امداد کے لیے وقف کرتا ہے، تو کیا اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ پاشا کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس کی قلمرو میں رہنے والے نوجوان یا تو تصویری خطوط میں برسہا برس تک منہمک رہیں، یا اُن عقائد و نظریات میں اپنی صلاحیتیں کھپائیں جو اوسائرس کے قصے کہانیوں میں گم ہیں یا ان مذہبی رسوم کی تلاش و جستجو میں قوتیں صرف کریں جن کی وساطت سے ماضی میں بلّی اور پیاز کے سامنے اظہارِ عقیدت کیا جاتا تھا۔ کیا آپ اسے تضاد سے تعبیر کریں گے! اگر وہ رقم نوجوانوں کو کاوک حروف متعین کرنے کی بجائے انگریزی اور فرانسیسی زبان اور وہ سارے علوم جن کے

لیے یہ زبانیں کمیا کی حیثیت رکھتی ہیں، سکھانے پر صرف کی جائے؟[1]

قدیم نظام کے حامی جن الفاظ کا سہارا لیتے ہیں اُن سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا، بلکہ ان کے بعد جو الفاظ موجود ہیں اُن سے قطعی اور حتمی طور پر اس کے بالکل برعکس نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ایک لاکھ کی رقم ہندوستان میں صرف احیائے ادب کے لیے ہی مختص نہیں کی گئی (اگرچہ اس نظریہ کے حامی سارا زور اسی جملہ پر صرف کر رہے ہیں) بلکہ اس کا مقصد انگریزی علاقوں کے رہنے والے لوگوں میں مختلف علوم و فنون کی ترویج و ترقی ہے۔ ان الفاظ میں اُن تمام تبدیلیوں کے لیے وجہِ جواز موجود ہے جن کے لیے میں پیہم کوشش کر رہا ہوں۔ اگر کونسل میری اس تعبیر سے متفق ہو تو پھر کسی نئے قانون کے وضع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اگر وہ اس امر میں مجھ سے اختلاف کرے تو پھر میں ایک ایسے مختصر قانون کا مسودہ تیار کروں گا جو ۱۸۱۳ء کے منشور کی اس بندش کو جو اس راہ کا سنگِ گراں ہے، کالعدم کر دیگا۔

میں جس زاویۂ نگاہ سے بحث کر رہا ہوں اس کا تعلق طریق کار سے ہے۔ مگر مشرقی طرزِ تعلیم کے پرستار اس معاملہ کو بالکل دوسری نہج پر سوچتے ہیں۔ اگر اُن کے استدلال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر کسی تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ عوام کا اعتماد اسی

---

[1] میکالے صاحب کا یہ منطقی مغالطہ قابلِ غور ہے۔ وہ دراصل چاہتے یہ تھے کہ کمپنی بہادر نے جو رقم احیائے علوم کے لیے مختص کی تھی اسے عربی اور سنسکرت کتابوں کی اشاعت اور ان زبانوں کی تعلیم پر صرف کرنا بند کر دیا جائے اور انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے وہ استدلال پیش کیا ہے جو اوپر آپ دیکھ رہے ہیں۔ گویا پاشائے مصر اگر کوئی رقم اس مقصد کے لیے مختص کرے تو اس کے دو ہی مصرف ممکن ہیں۔ یا تو تین چار ہزار برس پہلے کی مصری تہذیب کے مطالعہ پر اسے صرف کیا جائے، یا پھر انگریزی اور فرانسیسی زبان کی تعلیم پر۔ رہی تیسری صورت کہ خود پاشا کے اپنے زمانے کی عربی زبان اور اس کے علوم پر اسے صرف کیا جائے، یہ میکالے صاحب کے نزدیک خارج از بحث تھی۔

نظامِ تعلیم کو حاصل ہے جو اس وقت ملک میں رائج ہے۔ اس لیے اگر اس فنڈ کو جو ابھی تک صرف عربی اور سنسکرت کی توسیع و اشاعت پر خرچ ہوتا رہا ہے کسی اور مصرف میں استعمال کیا جائے تو ہمارا یہ فعل خالص تصرفِ بیجا کے مترادف ہو گا۔ میری سمجھ میں یہ چیز ابھی تک نہیں آئی کہ وہ کس منطق کی رو سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ سرکاری خزانہ سے جو مالی امداد ادب کی ترقی کے لیے عام طور پر دی جاتی ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے اُن اعانتوں سے بالکل مختلف نہیں ہے جو حکومت رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے دیتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم نے ایک مقام کو صحت کے نقطۂ نظر سے موزوں سمجھتے ہوئے وہاں ایک صحت گاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے اس فیصلے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر ہمیں متوقع نتائج نہ بھی حاصل ہوں تب بھی ہم اس صحت گاہ کو اسی مقام پر قائم رکھنے کے لیے اصرار کرتے رہیں۔ یا مثلاً ہم ایک بند کی تعمیر شروع کرتے ہیں۔ کیا ہمارا یہ فعل دیانت کے خلاف ہو گا اگر ہم ایک مرحلہ پر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کام کی کوئی افادیت نہیں ہے، اس کی تعمیر روک دیں؟ ملکیت کے حقوق بلاشبہ بڑے مقدس اور واجب الاحترام ہیں، مگر ان حقوق کو سب سے زیادہ نقصان جس چیز سے پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ بالعموم ان کے تحت ایسی چیزوں کو خواہ مخواہ کھینچ لاتے ہیں جو فی الواقع اُن کے حدود میں نہیں آسکتیں۔ جو لوگ غلط استعمالات و تصرفات کو حقوقِ ملکیت کی حرمت کے نام پر جائز ٹھیراتے ہیں وہ درحقیقت ملکیت کے اصول کو اس ذلت اور بدنامی کے خطرے میں مبتلا کر دیتے ہیں جو درحقیقت غلط تصرفات کے لیے مقدر ہے۔ اگر حکومت نے کسی فرد کو یہ یقین دلایا ہو، یا اور کچھ نہیں تو اس نے اپنے کسی قول یا فعل سے کسی شخص کے ذہن میں بجا طور پر یہ توقع ہی پیدا کر دی ہو کہ وہ سنسکرت یا عربی کے استاد یا طالب علم کی حیثیت سے ایک خاص مشاہرہ پائے گا، تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اس شخص کے مالی مفادات کی حفاظت اور پاسبانی کروں۔ میں تو یہاں تک جانے کے لیے بھی تیار ہوں کہ عوامی اعتماد کو قائم رکھنے کی خاطر جہاں تک ممکن ہو افراد کے ساتھ فیاضی برتی جائے خواہ وہ فیاضی غلط ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اس بات کا دعویٰ کرنا کہ مجھے تو

بالکل بے معنی نظر آتا ہے کہ حکومت نے بعض ایسی زبانوں اور ایسے علوم کی سرپرستی کا ذمہ لیا ہے جو فضول اور ناکارہ ہیں۔[1]

تعلیماتِ عامہ کے آئین و ضوابط میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی عہد و پیمان باندھا ہے۔ یا یہ رقم جن مقاصد کے لیے وقف کی گئی ہے وہ مقاصد بالکل لگے بندھے اور غیر متبدل ہیں۔ تاہم اگر یہ چیز موجود بھی ہوتی تب بھی میں اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ہمارے آبا و اجداد ہمیں کسی ایسے معاہدے کا پابند کرنے کے مجاز تھے۔ فرض کیجیے کہ گزشتہ صدی میں کارپردازانِ سلطنت پوری سنجیدگی سے یہ قانون وضع کر گئے ہوتے کہ رعایا کو ابدالآباد تک اسی طریقہ سے چیچک کے ٹیکے لگوائے جائیں جو ان کے عہد میں رائج تھا تو کیا اب جینر (JENNER) کے جدید انکشاف کے بعد حکومت کا اس طریقہ پر اصرار کرنا مناسب ہوگا؟ یہ مواعید جن کی تعمیل یا انجام دہی کی ذمہ داری نہ کسی فرد واحد پر عائد ہوتی ہے اور نہ جن کی پابندی سے کوئی کسی کو آزاد کر سکتا ہے، یہ مستقل حقوق جو درحقیقت کسی کو بھی بالاستقلال حاصل نہیں ہوتے، یہ عجیب ملکیت جس کا فی الواقع کوئی مالک نہیں، یہ نرالی چوری جس میں کسی کا مال بھی چرایا نہیں جاتا، ممکن ہے مجھ سے اعلیٰ اور ارفع دماغ کے لوگ ان باتوں کو سمجھ سکتے ہوں لیکن میرے ذہن کی رسائی سے تو بہرحال یہ ماورا ہیں۔ میرے نزدیک استدلال کا یہ طریق محض الفاظ کی بازیگری ہے جس کے ذریعہ ہندوستان اور انگلستان میں ہر اس غلط کارروائی کی بالالتزام مدافعت کی جاتی ہے جس کے لیے اور کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی۔[2]

---

[1] میکالے کا یہ استدلال اس مفروضے پر مبنی تھا کہ عربی اور سنسکرت بیکار زبانیں ہیں اور ان کے سب علوم فضول ہیں۔

[2] یہاں پھر میکالے نے محض شکوہِ لفظی کے بل پر سخت مغالطہ دیا ہے۔ فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اگر یہ یقین دلایا تھا کہ وہ اسی سے وصول کردہ ٹیکسوں کا ایک حصہ اس کی زبان اور اس کے علوم کی ترقی پر صرف کرے گی تو اس وعدے سے وہ ان دلیلوں کی بنا پر کیسے سبکدوش ہو سکتی تھی جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ اور اس وعدے کو آخر چیچک کے ٹیکوں والی مثال سے کیسے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ کیا محکوم قوم کی زبان اور علوم کو ترقی دینے کا ؟

میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ایک لاکھ کی رقم بالکل گورنر جنرل با جلاس کونسل کی مرضی پر موقوف ہے اور ہندوستان میں علم کی ترقی کے لیے وہ جس طرح بھی مناسب سمجھیں اسے صرف کرنے کے پوری طرح مجاز ہیں۔ وہ جس طرح اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ میسور میں شیر مارنے والوں کا انعام گھٹا دیں، یا معابد میں زرِ مرمت پر آئندہ کوئی رقم صرف نہ کریں، بالکل اسی طرح انہیں یہ فیصلہ کر دینے کا بھی پورا اختیار ہے کہ جو رقم عربی اور سنسکرت کی سرپرستی کے لیے صرف کی جا رہی ہے، اُسے اب اس مصرف میں نہ لایا جائے۔

اب میں معاملے کے اصل پہلو کو لیتا ہوں۔ ہمارے پاس ایک رقم ہے جسے حکومت کے فرمان کے مطابق اس ملک کے باشندوں کی علمی ترقی پر صرف کرنا مقصود ہے۔ اب سادہ سا سوال یہ ہے کہ اس رقم کا بہترین مصرف کیا ہو سکتا ہے؟

تمام طبقے (یعنی حکمران قوم کے طبقے) اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے اس حصہ کے رہنے والے جو مختلف بولیاں بولتے ہیں وہ ادبی اور علمی معلومات سے یکسر تہی دامن ہیں۔ پھر اُن کے الفاظ کا ذخیرہ اس قدر کم اور اندازِ بیان اس حد تک ناتراشیدہ ہے کہ جب تک انہیں کسی اور ذریعہ سے وسیع نہ کر دیا جائے، ان میں کسی قابلِ قدر علمی کام کو منتقل نہیں کیا جا سکتا[1]۔ یہ چیز اب ایک

۳۔ مفہوم لازماً یہی ہو سکتا تھا کہ محض ان کے قدیم علوم کی اشاعت کی جائے اور ان میں نئے علوم منتقل کرنے کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

[1] یہ پہلا مفروضہ ہی سراسر غلط تھا جس پر میکالے نے اپنے استدلال کی پوری عمارت اٹھائی تھی۔ اس کے قریب زمانے ہی میں حیدرآباد کے شمس الامراء اور بعض دوسرے لوگوں نے ریاضی اور فلکیات اور دوسرے سائنٹفک علوم پر اردو زبان میں کتابیں شائع کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ زبان ہر قسم کے علمی مضامین ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پھر اس کے تھوڑی مدت بعد ہی ڈپٹی نذیر احمد نے تعزیراتِ ہند اور ضابطہ فوجداری کا ترجمہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ قانون کے باریک سے باریک مسائل بھی اردو زبان میں بخوبی بیان کیے جا سکتے ہیں۔ اگر انگریز اپنے جھوٹے ترفع اور تعصب کی بنا پر یہاں کی زبانوں کو حقیر سمجھتے تھے اور ان کے ناکارہ ہونے

بدیہی حقیقت کے طور پر سامنے آچکی ہے کہ اس ملک کے جو طبقے اعلیٰ تعلیم پانے کے وسائل رکھتے ہیں اُن کا ذہنی نشو ونما دیسی زبانوں کے سوا کسی دوسری زبان کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے۔[۱]

وہ زبان کونسی ہو سکتی ہے؟ کمیٹی کے نصف ارکان کی رائے ہیں یہ زبان صرف انگریزی ہے۔ باقی اس مقام پر عربی اور سنسکرت کو فائز کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس امر کی چھان پھٹک کی جائے کہ کونسی زبان تعلیم و تعلّم کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔

مجھے نہ تو عربی سے کوئی واقفیت ہے اور نہ سنسکرت[۲] ہی سے۔ مگر ان کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے میں جو کچھ کر سکتا تھا اُس میں کوئی کسر میں نے نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے عربی اور سنسکرت

م۔ پر متفق تھے تو یہ اس فیصلے کے لیے کوئی معقول دلیل نہ تھی کہ یہاں کے لوگوں کے لیے ان کی مادری زبان کے بجائے ان کے حکمرانوں کی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا یا جائے۔ بعد میں حیدر آباد کی جامعۂ عثمانیہ کے تجربے کو جو شخص بھی دیکھے گا اس سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی کہ میکالے نے یہ الفاظ لکھ کر دراصل اُس وقت کے لوگوں کو ایک شرمناک دھوکا دیا تھا۔ میکالے کے زمانے کی اُردو اُس دَور کی انگریزی سے بدرجہا بہتر حالت میں تھی جبکہ لاطینی اور یونانی کے سوا یورپ کی کسی زبان میں بھی کوئی علمی سرمایہ نہ تھا۔ اگر اُس وقت میکالے کا استدلال اس کے حق میں استعمال کیا جاتا تو آج انگریزی زبان کسی شمار میں نہ ہوتی۔

[۱] قارئین کرام کو اس پوری تقریر میں اس قسم کے فقرات بکثرت ملیں گے جن سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو نیا نظامِ تعلیم ہم رائج کر رہے ہیں اس سے ہمارا اپنا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ اسی ملک کے رہنے والوں کی خواہش اور مفاد کے پیشِ نظر مرتب کیا گیا ہے۔ اس سرزمین کے ہر فرد نے پوری طرح یہ محسوس کر لیا ہے کہ وہ سارے علوم و فنون جو اُسے اسلاف سے ایک مقدس ورثہ کے طور پر ملے ہیں وہ بالکل عبث اور بیکار ہیں اور انگریز فرمانروا ان سے جتنی جلدی اس کا پیچھا چھڑا دیں اتنا ہی بہتر ہے۔ پھر ذہنی نشو ونما سے میکالے کی مراد یہ ہے کہ یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جائے جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے خالص انگریز ہو۔ جیسا کہ آگے چل کر خود اُس نے واضح کر دیا ہے۔

[۲] صاحب کی جسارت کی داد دیجیے کہ وہ بغیر واقفیت کے

کی مشہور و معروف کتابوں کے تراجم کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مَیں نے اُن لوگوں سے بھی، جنہیں ان مشرقی زبانوں پر دسترس حاصل ہے ــــ خواہ وہ اس ملک کے رہنے والے ہوں یا انگلستان کے ــــ تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ میں اس بات پر بھی تیار ہوں کہ مستشرقین جو اہمیت ان علوم کو دیتے ہیں وہی میں بھی دوں[1]۔ ان حضرات میں مجھے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس حقیقت سے انکار کرے کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی محض ایک الماری ہندوستان اور عرب کے سارے ادبی سرمایہ پر بھاری ہے[2]۔ مغربی ادب کی حقیقی فوقیت اور برتری کا کمیٹی کے اُن ارکان نے بھی اعتراف

۴۔ کسی زبان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

[1] یہ مستشرقین جن کی رائے کو اس قدر اہمیت دی جارہی ہے حاکم قوم کے ہی افراد ہیں۔ وہ مشرقی علوم سے کسی حد تک واقف تو ضرور ہیں مگر غلام قوم اور اُن کے علمی سرمایہ کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر بالکل وہی ہے جو دوسرے انگریزوں کا ہے۔ پھر مستشرقین کے جو علمی کارنامے بھی ہمارے سامنے آئے ہیں انہیں دیکھ کر نہ تو ہمیں اُن کے علم کے بارے میں کوئی حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی نیت بخیر معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی ساری کوششیں زیادہ تر ہماری تہذیب اور تاریخ کے بارے میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے پر مرکوز رہی ہیں اور یہی ان کے نزدیک قومی خدمت اور علمی کارنامہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج ہمارے اندر جس قدر ذہنی خلفشار موجود ہے اس میں ان حضرات کی "خدماتِ جلیلہ" کا بہت بڑا حصہ ہے۔

[2] میکالے صاحب اپنے علم و فضل کے باوجود اس سادہ سی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے کہ ایک قوم کے زمانۂ شباب کو دوسری قوم کے دورِ انحطاط کے بالمقابل رکھ کر ان دونوں کا موازنہ کرنا عقل و انصاف کے خلاف ہے۔ مسلمان بھی کبھی دنیا کی ایک اقبالمند قوم تھی اور اس نے اپنے دورِ عروج میں جس قدر حیرت انگیز ترقی کی اس کا اعتراف خود میکالے کے ہم مشرب بھی کرتے رہے ہیں۔ یہاں ہم چند اقتباسات درج کرتے ہیں:۔

"ہماری سائنس پر عربوں کا جو احسان ہے وہ صرف چونکا دینے والے انکشافات یا انقلابی نظریات پر مشتمل نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی زیادہ عربی ثقافت کی ممنونِ احسان ہے۔"

کیا ہے جو مشرقی نظامِ تعلیم کے حق میں ہیں۔

۴۔ کیونکہ دراصل سائنس کو اسی ثقافت نے جنم دیا ہے۔ دنیائے قدیم قبل سائنس کی دنیا تھی۔ یونانیوں کی فلکیات و ریاضیات باہر سے درآمد ہوئی تھیں۔ چنانچہ یونانی ثقافت انہیں پورے طور پر کبھی جذب نہ کر سکی۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی اپنے علوم کو مرتب کرتے تھے عمومیت دیتے تھے۔ نظریات قائم کرتے تھے لیکن صابرانہ تحقیق و تفتیش۔ ثبت علم کی فراہمی۔ سائنس کی باریک بینی۔ مفصل و طویل مشاہدات اور تجربی تجسس۔ یہ سب لوازمِ علمی یونانی مزاج سے قطعاً بعید تھے۔ قدیم کلاسیکی دنیا میں صرف ہیلانی اسکندریہ کے اندر سائنسی عمل کی سعی کا سراغ ملتا ہے۔ ہم جس چیز کو سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ان امور کا نتیجہ ہے کہ تحقیق کی نئی روح پیدا ہو گئی۔ تفتیش کے نئے طریقے معلوم کیے گئے۔ تجربے، مشاہدے اور پیمائش کے اسلوب اختیار کیے گئے۔ ریاضیات کو ترقی دی گئی اور یہ سب کچھ ایسی شکل میں رونما ہوا جس سے یونانی بالکل بے خبر تھے۔ دنیائے یورپ میں اس روح کو اور ان اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔" (تشکیل انسانیت از رابرٹ بریفالٹ ص ۲۴۸)

۵۔ وہ مسائل جو مسلم فلاسفہ کو درپیش تھے وہ مغربی مفکرین کو بھی برابر پریشان کرتے رہے۔۔۔۔ اگرچہ مسلم فلاسفہ کا اندازِ بحث بڑا علمی تھا مگر انہوں نے کبھی بھی اپنی تحقیقات کو مذہبی اعتقادات پر مسلط نہیں ہونے دیا۔۔۔۔ یہ کہنا غلط مبالغہ نہ ہوگا کہ عیسائی فلاسفہ کی یہ ترقی فارابی، ابن سینا، غزالی اور ابن رشد کے افکار و نظریات کی رہینِ منت ہے۔" (اسلام اور عرب از روم لانڈو)

۶۔ جب مغرب ابنِ رشد کو پہنچا اور اس نے گہرے علم کے لیے پیاس محسوس کی جب اس کے اندر پرانے افکار سے شناسائی پیدا کرنے کا احساس بیدار ہوا تو اس نے سب سے پہلے یونانی ماخذ کی طرف نہیں بلکہ عربی ماخذ کی طرف توجہ کی۔ (مقدمہ تاریخ سائنس جارج سارٹن)

یہ امر قریب قریب متفق علیہ ہے کہ مشرقی ادب میں سب سے نمایاں مقام شاعری کو حاصل ہے۔ میری آج تک کسی ایسے مستشرق سے ملاقات نہیں ہوئی جو اس بات کا دعویدار ہو کہ عربی اور سنسکرت شاعری کو یورپین شاعری کے مقابلہ میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم اُن تخلیقات کے دائرہ سے باہر نکل کر جن کا محور محض تخیل ہے اُن علوم کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں جو حقائق پر مبنی ہیں، جن میں تجربہ و مشاہدہ بطور اساس کام کرتے ہیں تو اس وقت یورپ کی فضیلت مسلّم ہو جاتی ہے۔ میرے اس دعوے میں مبالغہ کا قطعاً کوئی شائبہ نہ ہوگا۔ اگر میں کہوں کہ وہ سارا تاریخی مواد جو سنسکرت کی کتابوں سے اکٹھا کیا گیا ہے، قدر و قیمت کے اعتبار سے اُس مواد سے کہیں کم ہے جو انگلستان کے ابتدائی درجوں کے معمولی ملخصات میں موجود ہے۔ علم طبیعیات یا علم الاخلاق کے ہر شعبہ میں ان دونوں قوموں کے مابین تفاوت کا تناسب قریب قریب یہی ہے۔

پھر اصل صورتِ حال کیا ہوئی؟ ہمیں ایسے لوگوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہے جنہیں فی الحال ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے ہمیں لامحالہ انہیں غیر ملکی زبان ہی سکھانی ہوگی۔ اس سلسلہ میں جو استحقاق ہماری اپنی زبان کو حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں یہ ایک امتیازی حامل ہے۔ اس میں شاعری کا ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے جو حسنِ تخیل کے لحاظ سے اس سرمایہ سے کسی طرح فروتر نہیں جو ہمیں یونان سے ورثہ میں ملا ہے۔ فصاحت، طلاقت اور خطابت کے جو اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے ہو سکتے ہیں وہ سارے اس میں موجود ہیں، اس کے اندر جو تاریخی داستانیں بکھری پڑی ہیں کوئی دوسری زبان اُن کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ اس کی تاریخ ایک اخلاقی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے عدیم المثال ہے۔ اس میں انسانی زندگی اور انسانی فطرت کی نہایت صحیح اور دلفریب عکاسی پائی جاتی ہے۔ پھر اس میں اخلاقی، سیاسی، فقہی، تجارتی اور مابعد الطبیعی مسائل پر نہایت ادق بحثیں بھی ملتی ہیں۔

لہ (حاشیہ متعلقہ صفحہ سابق)۔ واضح رہے کہ کمیٹی کے سارے ارکان انگریز تھے۔ مشرقی نظام تعلیم کی حمایت جو اصحاب کر رہے تھے ان میں کوئی ہندوستانی نہ تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس میں ہر تجرباتی علم کے متعلق مکمل اور صحیح حقائق کا ایسا ذخیرہ موجود ہے جس کے ذریعہ صحت کی حفاظت، نوعِ بشری کے آرام و آسائش اور انسانی عقل و خرد کو جلا دینے میں انسان کو اچھی خاصی مدد ملی ہے۔ جو شخص اس زبان سے واقف ہے وہ اُس سارے علمی سرمایہ تک فوری دسترس رکھتا ہے جو دنیا کی دانشمند قوموں نے گزشتہ نو[٭] صدیوں میں اکٹھا کیا ہے۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ انگریزی ادب کو اُس سارے ادبی سرمایہ پر نمایاں فوقیت حاصل ہے جسے دنیا کی مختلف قوموں نے آج سے تین سو برس پیشتر تخلیق کیا تھا۔ یہی نہیں انگریزی زبان ہندوستان کے حکمراں طبقے کی زبان [ہے] ہے۔ اس ملک کے جو اونچے طبقے حکومت کے مراکز میں رہتے ہیں وہ بھی اسی زبان کے ذریعے اظہارِ خیال کرتے ہیں اور مستقبل قریب میں مشرقی سمندروں میں تجارت بھی اسی زبان کی وساطت سے کی جائیگی۔ پھر یہ دو ایسی ابھرتی ہوئی قوموں کی زبان ہے جو جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا میں نشوونما پا رہی ہیں اور ہندوستان سے اُن کا رابطہ دن بدن مضبوط ہوتا جارہا ہے۔ اب خواہ ہم اس زبان کے ذاتی اوصاف کی بنا پر یا ملک کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر کوئی قدم اٹھائیں۔ عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ تمام غیر ملکی زبانوں میں انگریزی زبان ہی ہماری رعایا کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوسکتی ہے۔

اب حل طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جب ہمیں ایک زبان کی تعلیم دینے کا اختیار حاصل ہے تو کیا پھر بھی ہم اُن زبانوں کی تعلیم دیں گے جن میں مسلمہ طور پر کسی موضوع سے متعلق بھی کوئی ایسی قابلِ قدر کتاب نہیں ملتی جسے ہماری زبان کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہو؟ جب ہم یورپین علوم پڑھانے کے معاملے میں بالکل آزاد ہیں تو کیا پھر بھی ہم اُن علوم کی تعلیم دیں گے جو یورپین علوم سے جہاں کہیں مختلف ہیں، وہاں اُن کی لغویت مسلمہ طور پر نمایاں ہے۔

جب ہم ایک صحیح فلسفہ اور تاریخ کی سرپرستی کرنے پر قدرت رکھتے ہیں تو کیا پھر بھی ہم سرکاری دولت کے صرف سے وہ طبی اصول پڑھائیں گے جن کو دیکھ کر انگلستان کا نعلبند بھی خفت محسوس

[٭] یہ انگریزی زبان کا وہ اصل استحقاق تھا جس کی بنا پر اسے ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

کرتا ہے[1] ۔ وہ علم ہیئات جس پر انگریزی سکولوں کی بچیاں بھی خندہ زن ہونگی[2] ۔ وہ علم تاریخ جو

[1] انگلستان کا نعل بند تو ممکن ہے مسکرا دے مگر کوئی ہوشمند اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر گستاولی بان اپنی مشہور تصنیف تمدنِ عرب میں تو عربوں کی برتری کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"عربوں کی طبّی ترقیاں زیادہ تر فنِ جراحی، علاماتِ امراض، قرابادین اور علم الادویہ میں ہیں۔ انھوں نے علاج کے بہت سے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ مثلاً میعادی بخار (TYPHOID) میں پانی کا استعمال کئی صدیوں تک متروک ہو جانے کے بعد اب دوبارہ جاری ہوا ہے۔ قرابادین میں انہوں نے بہت سی دوائیں بڑھائی ہیں۔ مثلاً خیار شنبر۔ سنا۔ ریوند چینی۔ تمر ہندی۔ کچلہ۔ حب القرمز۔ کافور۔ الکحل وغیرہ اور ادویۂ مرکبہ کے وہ گویا موجد ہیں اور اکثر مرکبات جو اس وقت مستعمل ہیں، شربت۔ لبوب۔ ضماد۔ دہنیات۔ روغن۔ عرقیات آن ہی سے ہم کو پہنچے . . . . فن جراحی کی بھی ابتدائی ترقی عربوں سے ہوئی اور زمانۂ حال تک اُن ہی کی تصنیفات پر یورپ کے طبّی مدارس کا دار و مدار رہا" (ص۵۵۴)

[2] جس علم ہیئت کی اس قدر تضحیک کی جا رہی ہے اُس کے متعلق تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عربوں نے اس میں حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ اس علم میں ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ دسویں صدی سے حسابات میں مماسہ کا استعمال

۲۔ اجرام سماوی کی حرکات کی زیچوں کا مرتب کرنا۔

۳۔ اعوجاج منطقۃ البروج اور اس زاویہ کے تدریجاً کم ہونے کی نہایت درست تحقیقات۔

۴۔ استعمال معدل النہار کا ٹھیک معلوم کرنا۔

۵۔ سب سے پہلے سال کی درست مدت کا تعین کرنا۔

۶۔ چاند کے زیادہ سے زیادہ ارتفاع کا اختلاف کرنا۔

۷۔ چاند کے اُس تغیر سے اختلاف کا معلوم کرنا جو آفتاب کے فاصلہ سے پیدا ہوتا ہے اور جسے اختلاف حرکتِ قمر کہتے ہیں اور جس کا انکشاف ۱۶۰۱ء میں ٹیکو براہے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ (تمدنِ عرب)

تیس تیس فٹ لمبے قد کے بادشاہوں کے تذکروں سے بھرا پڑا ہے جنہوں نے تیس تیس ہزار سال تک حکمرانی اور فرمانروائی کی[1] وہ جغرافیہ جو شیرے، راب اور مکھن کے سمندروں کے بیانات پر مشتمل ہے[2]

ہم اس راہ پر بغیر کسی سابقہ تجربے کے نہیں بڑھ رہے۔ تاریخ میں اس سے ملتے جلتے کئی ایک واقعات موجود ہیں اور ان سب سے ایک ہی سبق حاصل ہوتا ہے۔ دور نہ جائیے دورِ جدید میں اُس عظیم تحریک کی وہ قابلِ یادگار مثالیں دیکھیے جس نے پورے سماج کے ذہن کو متحرک کیا، تعصبات کے بندھن توڑے، علم پھیلایا، انسانی ذوق کو پاکیزگی بخشی اور وہ ممالک جن میں جہالت اور ذلت کا دور دورہ تھا اُن میں مختلف علوم و فنون کی آبیاری کی۔

پہلی مثال جس کی طرف میں اس وقت اشارہ کر رہا ہوں وہ احیاء العلوم کی وہ مہتم بالشان تحریک ہے جس نے یورپین اقوام کے اندر پندرہویں صدی کے اختتام اور سولھویں صدی کے آغاز میں جنم لیا[3]۔ اہلِ روما اور اہلِ یونان کی ادبی تخلیقات میں اُس وقت ہر ایسی چیز موجود تھی جسے قابلِ مطالعہ قرار دیا جاسکتا تھا۔ اگر ہمارے آبا و اجداد اُس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرتے

---

[1] مسلمانوں کا تو کوئی مورخ ایسا نہیں جس نے اس قسم کی تاریخ مرتب کی ہو۔ ابن خلدون کا مقدمہ آج بھی دنیا میں فلسفۂ تاریخ پر آخری کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میکالے کو عربی زبان کے تاریخ و جغرافیہ کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ اس نے صرف طلسمِ ہوش ربا پڑھ کر یہ نوٹ مرتب کر ڈالا۔

[3] یہ تحریک بھی عربوں ہی کی علمی کاوشوں کا صدقہ تھی:

"اسلامی فلسفہ نے نہ صرف یونانی افکار کی تہذیب کی بلکہ انہیں آگے بھی بڑھایا۔ اس نے عیسائی مفکرین کو فلسفہ اور مذہب کے درمیان تطبیق دینا سکھایا لیکن اسلامی فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دورِ متوسط کی تاریکی کو علم کی روشنی سے بدل دیا۔"

(اسلام اور عرب۔ روم لانڈو)

جو کہ اب تک مجلسِ تعلیماتِ عامّہ نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر وہ سسرو اور ٹیسی ٹس کی زبان کو نظر انداز کرتے اگر وہ اپنی ساری توجہ صرف اپنی بولی پر ہی مرکوز رکھتے، اگر وہ اینگلو سیکسونی قصے کہانیوں، اور نارمن فرنچ رومانی داستانوں کے علاوہ نہ تو کچھ پڑھاتے اور نہ ہی کچھ شائع کرتے، تو کیا انگلستان اس بلند مقام پر فائز ہو سکتا تھا جس پر وہ اس وقت فائز ہے؟ مور اور اسکام کے معاصرین کی نگاہ میں جو حیثیت یونانی اور لاطینی زبانوں کی تھی وہی حیثیت اہلِ ہند کے نزدیک انگریزی کی ہے۔ انگریزی ادب عہدِ عتیق کے ادب سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہے اور مجھے اس امر میں شک ہے کہ سنسکرتی ادب قدر و قیمت کے لحاظ سے ہمارے سیکسینی اور نارمن آبا و اجداد کی ادبی تخلیقات کے ہم پلہ بھی ہو سکتا ہے۔ علم کے بعض شعبوں مثلاً تاریخ میں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صورتِ حال اس سے بدرجہا بہتر ہے [1]

ایک دوسری مثال بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہ قوم جو ایک سو بیس سال پیشتر وحشت و بہیمیت کی اس منزل میں تھی جس میں کہ صلیبی جنگوں سے قبل ہمارے آبا و اجداد تھے، اس نے آہستہ آہستہ جہالت کے قعرِ عمیق سے نکل کر مہذب اقوام کے درمیان اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ میری مراد روس ہے۔ اب اس ملک میں ایک بہت بڑا تعلیم یافتہ طبقہ معرضِ وجود میں آچکا ہے جو ریاست کے اہم ترین امور کو سرانجام دینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ طبقہ کسی لحاظ سے بھی ان اصحابِ کمال سے فروتر نہیں ہے جن سے لندن و پیرس کے نہایت اونچے حلقوں کی تزئین ہوتی ہے۔ یہ

۱؎ میکالے نے یہاں پھر ایک مغالطہ دیا ہے۔ انگریزوں نے جو کچھ بھی ترقی کی وہ یونانی، لاطینی اور عربی زبانوں سے مدد لے کر ضرور کی، مگر انہوں نے ان کی مدد سے خود اپنی زبان کو مالا مال کیا اور اسے علمی زبان بنایا یہ غلطی انہوں نے ایک دن بھی نہیں کی کہ انگریزی کو چھوڑ کر کسی بیرونی زبان کو اپنی تعلیمی زبان بنا لیتے۔ لیکن میکالے اس مثال کو بنیاد بنا کر اس بات پر استدلال کر رہا ہے کہ ہندوستان میں دیسی زبانوں کو چھوڑ کر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے

عظیم سلطنت جس کی حالت ہمارے جدِ امجد کے عہد میں غالباً پنجاب (یعنی رنجیت سنگھ کے پنجاب) سے بھی بدتر تھی وہ آئندہ دو پشتوں تک ترقی کے میدان میں فرانس اور انگلستان کے ہمسر کا ب ہو گی۔ آخر یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا۔ نہ تو قومی تعصبات و امتیازات کو ہوا دینے سے، نہ روسی نوجوانوں کے دل و دماغ کو اُن بوڑھی عورتوں کے قصّے کہانیاں سنا کر پراگندہ کرنے سے۔ جن پر اُن کے غیر متمدن اور ناتراشیدہ آبا و اجداد ایمان رکھتے تھے، نہ اُن کے ذہنوں کو سینٹ نکولس کی خرافات کی آماجگاہ بنا کر، نہ انہیں اس اہم مسئلہ کے مطالعہ پر متوجہ کر کے کہ یہ دنیا تیرہ ستمبر کو تخلیق ہوئی تھی، نہ اُن لوگوں کو "ملکی علماء" کے اعزاز سے مشرف فرما کر جو ان عجائب و غرائب کا علمی احاطہ کر چکے ہوں ــــ یہ تبدیلی تو اُن غیر ملکی زبانوں کے سکھانے سے معرضِ وجود میں آئی جن میں معلومات کا سب سے زیادہ بیش قیمت خزانہ موجود ہے اور اس طرح علم کے سارے ذخائر تک اُن کی دسترس ہو گئی۔ مغربی یورپ کی زبانوں نے اہلِ روس کو مہذب اور متمدن بنایا ہے مجھے یقین ہے کہ ان زبانوں نے تاتاریوں کو جو کچھ دیا ہے اُس سے وہ ہندوؤں کو بھی مالا مال کر سکتی ہیں[۱]۔

آئیے اب ہم اُن دلائل کا جائزہ لیں جو اس طرزِ عمل کے خلاف جس کی تائید اصول اور تجربہ دونوں کرتے ہیں، بالعموم پیش کیے جاتے ہیں۔ بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں اہلِ ملک کا تعاون حاصل کرنا چاہیے اور یہ چیز ہم عربی اور سنسکرت پڑھائے بغیر نہیں کر سکتے۔

میں اس بات کو قطعاً تسلیم نہیں کر سکتا کہ جب ذہنی لحاظ سے ایک ترقی یافتہ قوم پر کسی نسبتہً جاہل قوم کے نظامِ تعلیم کی نگرانی کا فرض عائد ہو، تو اس صورتِ حال میں متعلمین سے کہا جائے کہ تم وہ نصاب طے کرو جسے اساتذۂ کرام تمہیں پڑھائیں۔ اس موضوع پر تو کچھ کہنا محض تحصیلِ حاصل ہے کیونکہ

---

[۱] یہ پھر وہی مغالطہ ہے۔ کیا روسیوں نے اپنی زبان چھوڑ کر کسی مغربی زبان کو اپنے ہاں ذریعہ تعلیم بنایا تھا اور یہی ان کی ترقی کا ذریعہ بنا؟ یا دراصل انہوں نے ساری ترقی اس بنا پر کی کہ دوسری زبانوں کے علوم لے کر اپنی زبان کو مالا مال کیا۔ دراصل میکالے صاحب نے وہ نسخہ ہمارے لیے تجویز کیا تھا جو کسی قوم کی ترقی کا نہیں بلکہ اسے ایسا غلام بنانے کا نسخہ تھا کہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہی بنی رہے۔

یہ امر ناقابلِ تردید شواہد سے ثابت ہے کہ ہمیں اس وقت اہلِ ملک کا تعاون حاصل نہیں ہے۔ مگر یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اہلِ ملک کی علمی و عقلی صحت کو نظر انداز کر کے ان کے ذوق کا پاس کرنے لگیں[1]۔ اور یہاں تو ہم ان کے ذوق کا پاس بھی نہیں کر رہے ہیں۔ ہم انہیں اُس تعلیم سے محروم کر رہے ہیں جسے حاصل کرنے کے وہ شدید طور پر آرزومند ہیں اور اُن پر وہ مضحکہ خیز نظامِ تعلیم مسلط کر رہے ہیں جس سے انہیں گھن آتی ہے۔

یہ بات اس امرِ واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ ہمیں عربی اور سنسکرت پڑھنے والے طلبا کو تو معاوضہ دینا پڑتا ہے مگر ان کے برعکس وہ لوگ۔ جو انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ فیس دینے پر بالکل آمادہ ہیں۔ اگر دنیا کی ساری طلاقتِ لسانی بھی محبت اور احترام کے اُن جذبات کے حق میں صرف کر دی جائے جو اس ملک کے لوگ اپنی مادری زبانوں کے لیے اپنے سینوں میں رکھتے ہیں تب بھی کوئی غیر جانبدار انسان اس بدیہی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ہمیں اپنی اس عظیم قلمرو کے اندر ایک طالب علم بھی ایسا نہیں ملا جسے وظیفہ دیئے بغیر ان زبانوں کے پڑھنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہو[2]۔

[1] علمی و عقلی صحت سے مراد غالباً محض کلرک بن سکنا ہے۔

[2] یہ عجیب بات ہے کہ پہلے تو ان لوگوں نے مشرقی علوم اور زبانیں پڑھنے والوں کے لیے رزق کے تمام دروازے بند کر کے صرف ان طالب علموں کے لیے روٹی اور عزت کے مواقع مخصوص کر دیئے جو انگریزی پڑھیں۔ پھر جب حال یہ ہو گیا کہ لوگ پیسے دے کر انگریزی پڑھنے لگے اور وظیفے لیے بغیر مشرقی علوم پڑھنے سے جی چرانے لگے تو اسے اس امر کی دلیل بنا لیا گیا کہ ہندوستان کے باشندوں کو تو اپنی زبانوں سے گھن آتی ہے اور وہ اپنے لیے انگریزی ہی پسند کرتے ہیں۔ تاہم واقعات تمام تر لارڈ میکالے کا ساتھ نہیں دیتے۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ ہے جسے گیرٹ صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں صاف الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کالج کے آغاز سے بیس برس تک گورنمنٹ کالج کے جتنے پرنسپل آئے وہ سب یہی رونا روتے رہے کہ وظائف کے بغیر لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ نہیں۔ چنانچہ نہ صرف طلباء کو وظائف دیئے گئے بلکہ تعلیم سے فارغ ہو چکنے کے بعد ان کے لیے ملازمتوں کا بھی انتظام کیا گیا۔ یہ اُس دور کے حالات ہیں جبکہ سرسید کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔

میرے سامنے اس وقت کلکتہ مدرسہ کے ایک مہینے یعنی دسمبر ۱۸۳۳ء کے حسابات ہیں عربی پڑھنے والے طلبا کی تعداد ۷۷ ہے اور ان سب کو مجموعی طور پر ہر مہینے پانچ سو روپے سے زائد وظائف دیئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے سامنے حساب کی یہ مد بھی موجود ہے: انگریزی پڑھنے والے طلبا سے گذشتہ ماہ مئی، جون اور جولائی میں وصول شدہ رقم ۱۰۳ روپیہ مذکورۂ بالا اخراجات میں سے منہا کیے گئے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس صورتِ حال پر میرا استعجاب یہاں کے مقامی حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ذاتی اخراجات سے تعلیم حاصل کرنے کا رواج قریب قریب ناپید ہے۔ لیکن یہ چیز تو میری رائے کو اور زیادہ تقویت بخشتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کہیں بھی لوگوں کو ایسے کاموں کے لیے کچھ دینا نہیں پڑتا جنہیں وہ خود اپنے لیے خوش آیند یا نفع آور خیال کرتے ہوں۔ ہندوستان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ ہندوستانی جب بھوک محسوس ہونے پر چاول کھاتے ہیں تو انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا، انہیں موسم سرما میں گرم کپڑے پہننے کے لیے بھی کوئی وظیفہ دے کر آمادہ نہیں کیا جاتا۔ جو صورتِ حال اس وقت ہمیں درپیش ہے اُس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ دیکھیے کہ وہ بچے جو دیہی مدارس میں ابتدائی حساب اور کتابیں پڑھتے ہیں انہیں استاد کوئی مادی صلہ نہیں دیتا بلکہ مدرس کو اس کی محنت کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ پھر آخر اُن لوگوں کو کیوں محنتانہ دیا جائے جو سنسکرت اور عربی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے اور اسے ہر شخص بڑی شدت کے ساتھ محسوس بھی کرتا ہے کہ سنسکرت اور عربی وہ ایسی زبانیں ہیں جن کے اکتساب سے اُس مشقت کی تلافی نہیں ہوتی جو انہیں سیکھنے کے لیے اٹھانی پڑتی ہے[۱]۔ یہاں اصل اور فیصلہ کن چیز صرف منڈی[۲] ہے۔

۱؎ انگریز کی یہاں تشریف آوری کے بعد ملک کے اندر اس قسم کی فضا تیار کرنے کی کوشش کی گئی جس میں یہ مشرقی علوم خود بخود دم توڑ دیں۔ اس بدلے ہوئے ماحول میں اگر یہ علوم ختم نہ ہوتے تو اور کیا ہوتا۔ اسے تو محض ایک معجزہ سمجھیے کہ ان علوم کے لیے اس قدر ناسازگار حالات پیدا کر دینے کے باوجود یہ آج تک زندہ چلے آ رہے ہیں۔

۲؎ یہ ہے کانٹے کی بات۔ پہلے ایک قوم کو بھوکا مارو یہاں تک کہ اس کے لیے سب کچھ منڈی میں فروخت ہو۔

اگر اس ضمن میں مزید شواہد درکار ہوں تو اُن کی بھی کوئی کمی نہیں۔ سنسکرت کالج کے قدیم طلبا نے گزشتہ سال کمیٹی کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ کالج میں دس بارہ سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور انہوں نے ہندو ادب اور علوم سے اچھی خاصی واقفیت پیدا کرلی ہے اور اسی سلسلہ میں انہیں اسنادِ فضیلت بھی مل چکی ہیں۔ لیکن اس کا ثمرہ انہیں کچھ بھی نہیں ملا۔ ان اسناد کے باوجود ابنائے وطن اُن سے بالکل بے توجہی برتتے ہیں۔ اپنے اہلِ ملک سے انہیں کسی مدد یا حوصلہ افزائی کی امید نظر نہیں آتی۔ اب اگر معزز کمیٹی ان کی دستگیری نہ کرے تو وہ اصلاحِ احوال کے کوئی امکانات نہیں دیکھتے۔ لہٰذا وہ ملتجی ہیں کہ حکومت کے تحت انہیں ایسے مناصب دینے کی حضور گورنر جنرل کی خدمت میں سفارش کی جائے جو اگرچہ بہت اونچے نہ سہی مگر انہیں زندہ رہنے کے قابل تو بنا دیں۔ انہیں بہتر رہائش اور ترقی کے لیے ذرائع کار درکار ہیں جنہیں وہ اس حکومت کی مدد کے بغیر حاصل نہیں کرسکتے جو بچپن سے ہی ان کی تعلیم کی کفیل رہی ہے۔ ان طلبا نے اپنی عرضداشت کو اس رقت انگیز التجا پر ختم کیا ہے کہ انہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ حکومت جس نے دورانِ تعلیم میں اُن کے ساتھ انتہائی فیاضی کا سلوک کیا ہے اُس کی کبھی یہ نیت نہ تھی کہ تعلیم کے بعد انہیں بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا۔

معاوضوں کے لیے حکومت کے سامنے جو عرضداشتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اکثر میری نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ ساری عرضداشتیں حتیٰ کہ سب سے زیادہ نامعقول درخواستیں بھی اس بنیاد پر مبنی ہیں کہ ان حضرات کا کوئی بہت زیادہ نقصان ہوا ہے یا ان کے ساتھ کوئی بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ یقیناً یہ پہلے داد خواہ ہیں جنہوں نے مفت تعلیم حاصل کرنے کا معاوضہ طلب کیا ہے۔

ہو ہونے والا مال بن جائے۔ پھر اس کے اپنے علوم کے لیے مارکیٹ میں مکمل کساد بازاری پیدا کردو اور فاتح قوم کے علوم حاصل کرنے والوں کو اچھے داموں خریدنا شروع کردو۔ اس کے بعد جب ان علوم کا بھاؤ آپ سے آپ چڑھ جائے تو اسے اس بات کی دلیل بناؤ کہ دیسی زبانیں اور ان کے علوم تو ہیں ہی ناکارہ ورنہ بازار میں ان کی قیمت اس قدر کیوں گر جاتی؟

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دس بارہ سال ملکی خزانے سے امداد ملتی رہی اور پھر انہیں ادب اور علوم سے خوب بھرپور کرکے دنیا میں بھیج دیا گیا۔ اب یہ اپنی اس تعلیم کو اپنے حق میں ایک ایسی زیادتی سے تعبیر کرتے ہیں جس کی حکومت کو تلافی کرنی چاہیے۔ ایک ایسی چوٹ جس کی تکلیف کے مقابلے میں وہ مالی امداد انہیں کم نظر آتی ہے جو انہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ میں ان لوگوں کو یقیناً برحق سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی حصّہ ایک ایسی چیز کو سیکھنے میں کھپایا ہے جس کے ذریعہ نہ تو وہ روٹی کما سکتے ہیں نہ انہیں معاشرہ میں عزت و احترام ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس رقم کو جسے ان لوگوں کو نکما اور بیکار بنانے پر صرف کیا گیا ہے کسی بہتر مصرف کے لیے بچا سکتے تھے۔ ریاست بہت کم خرچ کرکے بھی انہیں بڑی آسانی کے ساتھ اہلِ ملک کے لیے ایک بوجھ اور تذلیل و تحقیر کا ہدف بنانے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ مگر ہم نے اس پالیسی کو اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم نے حق اور باطل کی کشمکش میں غیر متعلق تماشائی بن کر رہنا بھی گوارا نہ کیا۔ بلکہ ہم اس بات پر بھی قانع نہ ہوئے کہ اہل ملک کو اپنے آبائی تعصبات کا اثر قبول کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے۔ ہم نے خود آگے بڑھ کر اُن قدرتی موانع کے ساتھ جو مشرق میں حقیقی علمی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، اپنی طرف سے بہت سی مشکلات کا اضافہ کر لیا۔ وہ مراعات و وظائف جنہیں شاید ہم حق و صداقت[1] کی نشر و اشاعت پر بھی خرچ کرنا مناسب نہ سمجھیں۔ انہیں غلط ذوق اور باطل فلسفہ کے پھیلانے پر ہم بے دریغ خرچ کر رہے ہیں۔

ہمارے اس طرزِ عمل سے وہ برائی پروان چڑھ رہی ہے جس سے ہمیں خدشہ لاحق ہے ہم اُس مخالفت کو جنم دے رہے ہیں جو فی الحال ناپید ہے۔ عربی اور سنسکرت کالجوں پر اس وقت جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ نہ صرف صداقت کی حق تلفی ہے بلکہ سرکاری خزانے سے غلط کاروں کی پرورش کی جا رہی ہے۔ اس رقم سے ایسی پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی ہیں جن میں نہ صرف

---

[1] سوال یہ ہے کہ اس قسم کے حوصلہ شکن حالات آخر پیدا کس نے کیے۔ یہ تو صرف سرکار انگریزی کی کرم فرمائی تھی کہ اس ملک کے لوگ اپنے علوم پڑھ کر اس درجہ خوار ہونے لگے۔

مجبور و بے بس بے روزگار پناہ لیتے ہیں بلکہ ان کے اندر ایسے متعصب اور تنگ نظر لوگوں کو بھی پرورش کیا جا رہا ہے۔ جو اپنے تعصبات اور مفادات کی بنا پر ہر نئی تعلیمی سکیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔[1] اگر ہندوستان میں اُس تبدیلی کے خلاف جس کی میں اس وقت وکالت کر رہا ہوں، کچھ بھی جذبہ موجود ہے تو یہ ہمارے اپنے نظام کا نتیجہ ہے۔ اس مخالفت کے قائدین وہی لوگ ہونگے جو ہمارے وظائف پر پلے ہیں اور ہمارے اپنے کالجوں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم اپنی موجودہ روش پر جتنے لمبے عرصے تک گامزن رہیں گے، اتنی ہی مخالفت تیز تر ہوتی چلی جائے گی اور اس تحریک کو ہر سال ہم اپنی جیب سے خرچ کر کے ایسے تازہ دم مردان کار مہیا کریں گے جو اس کی تقویت کا باعث ہونگے۔ اگر اہلِ ملک کو صرف اپنے حال پر ہی چھوڑ دیا جائے تو ہمیں کسی قسم کی مشکلات کا اندیشہ نہیں۔ ساری بک بک اسی مشرقی مفاد کی طرف سے ہو گی جسے ہم نے بالکل مصنوعی طریقوں سے پیدا کر کے قوت و توانائی بخشی ہے۔

ایک اور امر بھی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ اگر رائے عامہ سے تعرض نہ کیا جائے تو وہ فی الواقع اُس انداز سے مختلف ہو گی جس انداز سے کہ قدیم نظامِ تعلیم کے حامی اُسے پیش کرتے ہیں۔ کمیٹی نے عربی اور سنسکرت کی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک لاکھ کی رقم وقف کی مگر ان کتابوں کی اب کوئی نکاسی نہیں۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ کتاب فروخت ہو جاتی ہے۔ تئیس ہزار نسخے جن میں بیشتر کی ابھی تک جزوبندی بھی نہیں ہوئی، مختلف لائبریریوں یا کمیٹی کے گودام میں بکھرے پڑے ہیں۔ کمیٹی نے مشرقی ادب کے اس وسیع ذخیرے کے ایک حصے سے خلاصی پانے کے لیے کتابوں کی مفت تقسیم شروع کی مگر وہ جس رفتار سے شائع ہو رہی ہیں اُس رفتار سے تقسیم نہیں کی جا سکتیں سال بھر میں بیس ہزار روپے کی رقم ان ردی کاغذوں میں اضافہ پر صرف کی جا رہی ہے جن کا سٹاک ہمارے پاس کافی مقدار میں پہلے سے موجود ہے۔ گزشتہ تین سالوں میں اس

[1] یہ ہے اصل تضاد جو کھٹک رہا ہے۔

طرح تقریباً ساٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں۔ لیکن اسی عرصہ میں عربی اور سنسکرت کتابوں کی فروخت سے جو آمدنی ہوئی ہے وہ بمشکل ایک ہزار روپیہ تک پہنچتی ہے[۱]۔ اس کے برعکس اسی اثنا میں سکول بک سوسائٹی نے انگریزی کتابوں کی سات یا آٹھ ہزار جلدیں سالانہ فروخت کی ہیں۔ فروخت کے ان حاصلات سے نہ صرف اشاعت کے اخراجات پورے ہو رہے ہیں بلکہ سرمایہ پر بیس فیصد نفع بھی مل رہا ہے۔

اس بات پر بہت اصرار کیا گیا ہے کہ ہندو قانون تو سنسکرت کی کتابوں سے اور محمڈن لا عربی کتابوں ہی سے اخذ کرنا ہوگا لیکن یہ معاملہ مسئلہ زیر بحث پر کوئی اثر نہیں ڈالتا ہمیں پارلیمنٹ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم ہندوستان کے لیے قوانین مرتب کریں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں لا کمیشن کی امداد بھی بہم پہنچائی گئی ہے۔ جس وقت نیا ضابطۂ قانون نافذ ہوگا اسی وقت منصفوں اور صدر امینوں کے لیے شاستر اور ہدایہ بالکل بیکار ہو جائیں گی۔ مجھے امید واثق ہے کہ وہ طلبا جنہوں نے اب عربی مدارس اور سنسکرت کالجوں میں داخلہ لیا ہے، اُن کے تعلیم سے فارغ ہونے سے پیشتر، یہ عظیم کام پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہوگا۔ ہمارا یہ فعل بدیہی طور پر احمقانہ ہوگا کہ ہم نئی نسل کو اُن حالات کے پیشِ نظر تعلیم دیں جنہیں اُن کے جوان ہونے سے پہلے ہم بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں[۲]۔

---

[۱] ان کتب کی نشر و اشاعت کا معاملہ بھی بڑا ہی دلچسپ ہے۔ سنسکرت کی کتابوں کے بارے میں ہم کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن فارسی اور عربی کی کتب کے متعلق یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کا انتخاب انتہائی ناقص تھا۔ اس وجہ سے ان کا صحیح طور پر نکاس نہ ہو سکا۔

[۲] لارڈ میکالے کا طرزِ استدلال ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ ملک کے سارے حالات، خواہ اُن کا تعلق سیاست سے ہو یا قانون یا معیشت یا معاشرت سے، بدل دینے کا تہیہ کر چکے ہیں اور دوسری طرف وہ اہلِ ملک کے متعلق یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو پرانے نظامِ تعلیم سے کوئی لگاؤ اور دلچسپی نہیں۔ جن لوگوں کو اپنی تعلیماتِ حیات سے صحیح معنوں میں وابستگی رہی وہ تو آخر دم تک اسی نظامِ تعلیم کے حامی رہے جو انہیں اپنے اسلاف سے ملا تھا۔ باقی رہے وہ حضرات؟

عربی اور سنسکرت کے حق میں ایک اور دلیل جو اس سے بھی کہیں زیادہ کمزور اور بودی ہے، یہ دی جاتی ہے کہ ان زبانوں میں چونکہ کروڑوں انسانوں کی مقدس کتابیں موجود ہیں اس بنا پر یہ خصوصی امداد کی مستحق ہیں۔ سرکار انگریزی کا بلاشبہ یہ فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے مذہبی معاملات میں نہ صرف روادار ہو بلکہ غیر جانبدار بھی ہو۔ مگر کسی ایسے ادب کی (جو مسلمہ طور پر بہت کم قدر و قیمت کا حامل ہے) محض اس وجہ سے حوصلہ افزائی کرتے چلے جانا کہ اس میں بعض اہم موضوعات پر انتہائی غلط باتیں موجود ہیں، میرے نزدیک ایک ایسی روش ہے جس کی تائید نہ تو عقل کرتی ہے نہ اخلاق۔ اور نہ وہ غیر جانبداری جس کا قائم رکھنا ہم سب کا ایک مقدس فرض ہے۔ ایک ایسی زبان جس کے بارے میں ہر شخص (یعنی ہر انگریز) تسلیم کرتا ہے کہ اس کا دامن ہر قسم کی مفید معلومات سے خالی ہے، کیا اس کے پڑھانے کا اس لیے التزام کیا جائے کیونکہ یہ ہیبت ناک اوہام کو جنم دیتی ہے؟ کیا ہم جھوٹی تاریخ، غلط علم ہیئت اور غلط تاریخ محض اس لیے پڑھائیں کہ ان سے ایک باطل مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ ہم اس بات سے بہت زیادہ احتراز کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کہ اُن مسیحی مشنریوں کی سرکاری طور پر پشت پناہی کی جائے جو اہلِ ملک کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں[1]۔ جب عیسائیت کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل یہ ہے تو کیا مناسب ہوگا کہ ہم حکومت کے خزانے سے رشوت دیکر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنی نئی نسل کو اس قسم کی تعلیم دلوائے جس کے ذریعہ انسان یہ جان سکے کہ گدھے کو چھونے کے بعد آدمی کس طرح پاک ہو سکتا ہے یا وید کے کن اشلوکوں سے بکرا مار دینے کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

مشرقی علوم کے حامی اس بات کو ایک تسلیم شدہ حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس ملک کا کوئی

۱۔ جو بر چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کرنے والے تھے اور جن کی پیشانی ابھرتے ہوئے اقتدار کے سامنے فوراً جھک جاتی تھی۔ جن کی نگاہ پیٹ اور جیب سے آگے نہیں گزرتی تھی وہ اگر بدلے ہوئے حالات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے نئے نظامِ تعلیم کو خوش آمدید کہنے لگے تو اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔

باشندہ انگریزی زبان کی بالکل ابتدائی واقفیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا[1]۔ وہ اسے ثابت تو نہیں کر پاتے مگر اس پر ہمیشہ اصرار ضرور کرتے ہیں۔ یہ حضرات محض تحقیر کے طور پر انگریزی تعلیم کو محض ہجے سکھانے کی تعلیم سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اصل مسئلہ نہایت اونچے درجے کے ہندی اور عربی علم و ادب اور انگریزی مبادیات کی سطحی معلومات کے مابین انتخاب ہے۔ یہ نہ صرف ایک مفروضہ ہے بلکہ ایک ایسا مفروضہ جس کی عقل اور تجربہ دونوں تائید نہیں کرتے۔ ہم اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہیں کہ ساری قوموں کے لوگ ہماری زبان سے اس حد تک واقف ہیں جس سے وہ بآسانی اُن دقیق اور پیچیدہ مسائل کو سمجھ سکتے ہیں جن سے اس زبان کا دامن بھرپور ہے اور اس کے ذریعہ وہ اُن ادبی لطافتوں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہونے کی استعداد رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں کے اعلیٰ انشا پردازوں کی تحریروں میں موجود ہیں۔ اسی شہر (کلکتہ) میں بہت سے ایسے ہندوستانی موجود ہیں جو انگریزی زبان میں بڑی سلاست اور جامعیت کے ساتھ سیاسی اور علمی موضوعات پر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ میں نے اسی مسئلہ پر جس کے متعلق میں اس وقت تحریر کر رہا ہوں بعض ہندوستانی شرفاء کو اس کشادہ دلی اور فہم و فراست کے ساتھ بحث کرتے ہوئے دیکھا ہے جو مجلس تعلیماتِ عامہ کے ارکان کے لیے بھی عزت و افتخار کا باعث ہو سکتی ہے۔ براعظم یورپ کے ادبی حلقوں میں بھی ایسے غیر ملکی شاید خال خال ہی ملیں جو اتنی رواں اور صحیح انگریزی بول سکیں جتنی کہ بعض ہندو بولنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس امر سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ انگریزی ایک ہندو کے لیے اتنی مشکل نہیں جتنی کہ یونانی ایک انگریز کے لیے ہو سکتی ہے۔ جتنے عرصے میں ہمارے بدنصیب طلبا سنسکرت کالج سے فارغ ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ کم مدت میں ایک ذہین انگریز نوجوان یونانی مصنفین کی تحریروں کو پڑھنے، ان سے لطف اندوز ہونے اور ان کا تتبع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک انگریز نوجوان جتنا

---

[1] گزشتہ دو سو سال کے واقعات نے تو ان حضرات کے اس دعویٰ کو بالکل صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آخر ہم نے اتنی محنت و مشقت کے بعد انگریزی میں کتنے شیکسپیئر، کتنے ملٹن اور کتنے کارلائل اور رسکن پیدا کیے ہیں؟ دوسری طرف دیکھ لیجیے کہ غلامی اور انحطاط کے باوجود اسی مدت کے اندر ہمارے ہاں اپنی زبان کے کیسے کیسے نامور ادیب پیدا ہوئے۔

وقت ہیروڈوٹس اور سفوکلیز کو سمجھنے کے لیے لیتا ہے اس سے کم مدت میں ایک ہندو کو ہیوم اور ملٹن سمجھ لینا چاہیے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ ہم پارلیمنٹ کے ۱۸۱۳ء کے قانون کے کسی طرح بھی پابند نہیں۔ ہم کسی ایسے معاہدے کی جکڑبندیوں میں بھی گرفتار نہیں جو ہم نے صراحتاً یا کنایتہً کیا ہو۔ ہم اپنے فنڈ کے استعمال میں یکسر آزاد اور خود مختار ہیں۔ ہمیں اس رقم کو اس تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے جو موزوں ہے اور اس نقطۂ نظر سے انگریزی زبان سنسکرت اور عربی کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے۔ اس ملک کے رہنے والے عربی اور سنسکرت پڑھنے کے قطعاً خواہشمند نہیں بلکہ انگریزی سیکھنے کے متمنی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں قانونی ضرورت کے تحت بھی اور مذہبی ضرورت کے پیشِ نظر بھی کسی خصوصی امداد کی مستحق نہیں ٹھہرائی جا سکتیں۔ اس ملک کے باشندوں میں ہم انگریزی کے بہت اچھے فاضل پیدا کر سکتے ہیں اور اسی مقصد پر ہماری ساری کوششیں مرکوز ہونی چاہییں

میں اُن حضرات سے جن کی میں نے مخالفت کی ہے ایک معاملہ میں پوری طرح متفق ہوں۔ میرا ذاتی تاثر بھی اُن کے احساس کی طرح یہی ہے کہ ہم فی الحال اپنے محدود ذرائع کے ساتھ سب لوگوں کی تعلیم کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس وقت بس ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے جن پر ہم اس وقت حکمران ہیں ــــ ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے انگریز۔ پھر اُس کام کی ذمہ داری اس طبقے پر چھوڑ دیں کہ وہ اس ملک کی بولیوں کو سنوارے، مغربی علوم سے سائنسی اصطلاحات لے کر ان زبانوں کو مالا مال کرے اور آہستہ آہستہ انہیں اس قابل بنائے کہ ان کے ذریعہ ملک کی عام آبادی کو تعلیم دی جا سکے۔

اس وقت جو مفادات موجود ہیں مجھے اُن کا پورا پورا احترام ہے۔ میں ان سارے افراد سے فیاضانہ سلوک اور برتاؤ کرنے کے لیے تیار ہوں جو جائز طور پر مالی امداد کے حقدار ہیں۔ لیکن میں اس غلط نظامِ تعلیم کو، جس کی ابھی تک ہم آبیاری کرتے چلے آ رہے ہیں، بیخ و بُن سے اکھاڑ دینا چاہتا

ہوں۔ میں فی الفور عربی اور سنسکرت کتب کی طباعت روکنے اور مدرسہ عالیہ اور سنسکرت کالج کو منتقل کر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بنارس برہمنی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے اور دہلی عربی کا۔ اگر ہم صرف بنارس میں سنسکرت کالج اور دہلی میں عربی کالج قائم رکھیں تو میرے نزدیک مشرقی زبانوں کے حق میں یہی چیز کافی، بلکہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر بنارس اور دہلی کے کالجوں کو قائم رکھنا ہو تو میں کم از کم اس بات کی سفارش ضرور کروں گا کہ جو طلبہ ان کی طرف رجوع کرنے میں انہیں قطعاً کوئی وظیفہ نہ دیا جائے۔ بلکہ لوگ دو متقابل نظامہائے تعلیم کے درمیان انتخاب کرنے میں بالکل آزاد ہوں اور انہیں قطعی طور پر کسی ناجائز ترغیب سے ایسی تعلیم کے حصول پر آمادہ نہ کیا جائے جس کے لیے وہ خود تیار نہیں ہیں۔ اس طرح وہ فنڈ جو ہمارے ہاتھ آئیں گے ان سے ہم کلکتہ کے ہندو کالج کو جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی، نسبتاً زیادہ مالی امداد بہم پہنچا سکیں گے اور اس قابل ہونگے کہ فورٹ ولیم اور آگرہ پریذیڈنسی کے بڑے بڑے شہروں میں ایسے سکول قائم کریں جن میں انگریزی زبان اچھی طرح پڑھائی جاسکتی ہو۔

اگر ہز لارڈشپ باجلاس کونسل کا فیصلہ یہی ہو، اور جیسا کہ میں امید کرتا ہوں، یہی ہوگا، تو پھر میں اپنے فرائض کو پورے جذبہ اور مستعدی سے ادا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اگر بالفرض حکومت موجودہ نظام کو جوں کا توں قائم رکھنے کا ارادہ رکھتی ہو تو پھر میری درخواست یہ ہے کہ مجھے اس کمیٹی کی صدارت سے سبکدوش ہونے کی اجازت دی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہاں میرا وجود کسی افادیت کا حامل نہیں۔ پھر مجھے اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ اس صورت حال میں ایک ایسے نظام کی حمایت کرنے کا ارتکاب کرونگا جسے میں ایمانداری سے اپنی دانست میں محض ایک فریب نظر سمجھتا ہوں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ موجودہ نظام سے حق و صداقت کی ترقی نہیں ہوئی بلکہ اس سے دم توڑتی ہوئی غلط کاریوں کی طبعی موت میں کچھ تعویق ہو رہی ہے۔ میرے نزدیک ہم اس بات کے قطعاً مستحق نہیں کہ ہمیں مجلس تعلیمات عامہ کے معزز امتیاز سے مشرف کیا جائے۔ ہم تو ایک ایسی منڈلی ہیں جو روپیہ کا زیاں کر رہی ہے، ایسی کتابیں شائع کر رہی ہے

جن کے چھپنے سے کاغذ کی قیمت اتنی بھی نہیں رہتی جتنی ان کے چھپنے سے پہلے ہوتی ہے، لغو تاریخ لغو الٰہیات، لغو طبعیات ، اور لغو دینیات کو بالکل مصنوعی طریق سے فروغ دے رہی ہے۔ اہلِ علم کا ایک ایسا گروہ تیار کر رہی ہے جو اس علم کو اپنے حق میں ایک مصیبت اور عار سمجھتا ہے۔ جو دوران تعلیم عوام کی امداد پر بسر اوقات کرتا ہے اور جس کی تعلیم اتنی بیکار اور غیر مفید ہے کہ اسے حاصل کر لینے کے بعد بھی یا تو وہ فاقہ مستی کا شکار ہوتا ہے یا زندگی کے باقی ایام لوگوں کی خیرات پر گذارا کرتا ہے۔ ان احساسات و نظریات کے ساتھ میں طبعاً اُس مجلس کی ذمہ داری میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا جس کے انداز اور طرزِ عمل کو اگر بدلا نہ گیا تو وہ میرے نزدیک نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ لازمی طور پر نقصان دہ اور مضرت رساں بھی ہے۔

(بقیہ اشارات)

اس مقصد کی تکمیل کے لیے جگہ جگہ سکول اور کالج کھولے گئے۔ پنجاب اور یو۔پی میں بیسیوں ایسے مراکز قائم ہو گئے جن سے مشن کے لٹریچر کی اشاعت ہوتی تھی۔ سیرام پور مشن کا پہلا ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" انہیں مقاصد کا آئینہ دار تھا۔

ان عیسائی مشنوں کو "عیسائیت" پھیلانے میں تو کوئی قابلِ لحاظ کامیابی نہ ہوئی، البتہ انہیں اس باب میں یقینی کامیابی حاصل ہو گئی کہ لوگوں کے سامنے جب مذہب کا نام لیا جائے تو ذہن ایک ایسے نظریے کی طرف منتقل ہو جائے جس میں عقل کا کوئی دخل نہ ہو، وہ سرتا پا توہم پرستی، بے دلیل عقیدت، اندھے یقین، اور جاہلانہ تعصبات کا مجموعہ ہو اور عملی زندگی میں انسان کی قطعاً کوئی رہنمائی نہ کر سکے بلکہ اس کی ترقی کی راہ میں روک کا کام دے اور اس طرح ذہین و فطین لوگوں کی نظر میں یہ خود بخود ایک اضحوکہ بن جائے اور وہ جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں۔

یہ ہیں مختصر طور پر وہ تدابیر جن سے مسلمانوں کی متاعِ ایمان کی قیمت گرانے میں کام لیا گیا۔ اس پروگرام کا تیسرا جزو نظامِ تعلیم ہے جس پر انشاء اللہ آئندہ شمارے میں بحث کریں گے۔ (باقی)